نیا رجحان: جدید ترقی پسندی

پروفیسر اسلم جمشید پوری

تلخیص: وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ۔اس طرح نئے دور کے ساتھ نئے ادبی رجحانات ورویے تشکیل پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں کئی ادبی تحریکوں اور رجحانوں نے جنم لیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اردو زبان وادب کی مقبول تحریک رہی ہے جس کی بدولت اردو شعر وادب کا اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ بالآخر ترقی پسند تحریک کا زوال ہوا اور ایک نیا ادبی رجحان جدیدیت کے نام سے چل پڑا۔ لیکن ترقی پسندی سرے سے ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے نئے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی اور روایتی ترقی پسندی کے کئی پہلوؤں سے کنارہ کشی اختیار کر کے جدید دور کے انسان کے مسائل کو نئے انداز اور منفرد ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے؛ جسے جدید ترقی پسندی کا نام دیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: تحریک، رجحان، جدیدیت، ترقی پسند تحریک، جدید ترقی پسندی، نئے ادبی رجحانات۔

کوئی بھی تحریک یا رجحان شعور کی وہ منزل ہوتی ہے جب ہم اپنے خیال اور نظریے میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ کوئی بھی نظریہ، رویہ، رجحان اور تحریک انسانی عادات و خصائل کو سمجھنے اور عام کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ جب ہم کسی چیز کو دیکھتے، سنتے، پڑھتے اور محسوس کرتے ہیں تو ہمارے اندر اس چیز یا تحریر کے متعلق مثبت یا منفی رائے بن جاتی ہے۔ جس کا تعلق ہمارے نظریہ اور زاویہ ہوتا ہے۔ یہی نظریہ اور زاویہ جب پختہ دلیلوں اور

شہادتوں پر مبنی ہوتا ہے اور کسی چیز کو پرکھنے میں مدد کرتا ہے تو یہ نظریہ بن جاتا ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ کوئی بھی نظریہ اس کے پرکھنے والے اور اس کو قائم کرنے والے کے درمیان ایک پل کی صورت ہوتا ہے۔ کوئی بھی نظریہ اس وقت تک مقبول نہیں ہوتا جب تک اسے موصول کرنے والے لوگ نہیں ہوتے۔ حمایت اور تردید تو بعد کا مرحلہ ہے۔ اور کوئی بھی نظریہ جب قبول ورد کی منزلوں سے گزر کر بہت بڑی آبادی کو متاثر کرتا ہے اور اس کے قبول ورد کرنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہتا ہے تو پھر وہ رجحان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

جب کسی بھی نظریہ کو عام کرنے کے لئے بہت سے لوگ باقاعدگی سے لگ جائیں۔ اس کا کوئی واضح مقصد ہو اور مقصد کے حصول کے لئے تنظیم بنے، جلسے جلوس ہوں، کانفرنس، سیمینار اور سمپوزیم ہوں، تب وہ نظریہ تحریک کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تحریک میں باضابطگی اور تحریری شکل میں اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ ہم خیال لوگوں کا ایک حلقہ بنایا جاتا ہے۔ جو تحریک کے مقاصد کو عام کرنے میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔ ان اصولوں پر دیکھا جائے تو اردو میں تحریک کہی جانے والی بہت سی تحریکیں، تحریک نہیں ہیں۔ کچھ کچھ ہم علی گڑھ تحریک کو اس زمرہ میں شامل کر سکتے ہیں لیکن اردو میں باقاعدگی اور باضابطگی کی بنیادوں پر صرف ترقی پسند تحریک پوری اترتی ہے۔ پاکستان کے معروف ناقد ڈاکٹر انور سدید تحریک کے تعلق سے اپنی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں رقم طراز ہیں۔

> ''ہر تحریک اپنا دائرۂ عمل خود وضع کرتی ہے اور معینہ حدود میں رہ کر انسان اور معاشرے کی جامد حالت منقلب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تحرک پیدا کرنے کے لئے تو کسی ایک مردِ راہ داں کی تخیلی پرواز، داخلی کلبلاہٹ، ذاتی سوچ اور انفرادی کوشش بھی کارگر ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی تحریک کے وسیع اثرات کو معاشرے میں مقبول بنانے کے لئے اجتماعی کوشش بے حد ضروری ہے۔ تحریک چونکہ انفرادی عمل کم اور اجتماعی عمل زیادہ ہے اس لئے جہاں محرکِ تحریک کو اہمیت

حاصل ہے وہاں وابستگانِ تحریک کی ذہنی، فکری اور جذباتی ہم آہنگی بھی بے حد اہم ہے۔''

(اردو ادب کی تحریکیں۔ انور سدید، ص ۲۷، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۴)

کسی بھی تحریک یا رجحان کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ ۲۵۔۲۰ سال تک اپنے شباب پر رہتا ہے اور اس کے بعد وہ زمانے کی نئی تبدیلیوں کا شکار ہو کر رو بہ زوال ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی بھی تحریک یا رجحان کی مثبت قدریں بہت دنوں تک زندہ رہتی ہیں۔ بلکہ کچھ قدریں تو ہمیشہ زندہ رہتی ہیں اور نئی تحریک اور نئے رجحان کے ساتھ مل کر ان میں ضم ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم ترقی پسند تحریک کو اردو کی پہلی باضابطہ تحریک مان لیں تو اس کی ابتداء اور ارتقا ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک کا زمانہ ہے۔ یعنی ۲۴ سال میں اس تحریک کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ہم بغور مطالعہ کریں تو ۱۹۵۵ء کے بعد ہی ترقی پسند تحریک زوال پذیر ہونے لگی تھی۔ ایک نیا رجحان 'جدیدیت' اس کی جگہ لینے کو سامنے آ گیا تھا۔ جس نے ۱۹۶۰ء کے بعد ترقی پسند تحریک کو Replace کر دیا تھا۔

'جدیدیت' ایک رجحان کے طور پر سامنے آئی اور ۱۹۶۰ء سے لے کر ۷۲-۱۹۷۱ء تک پورے ادبی منظر نامے پر چھا گئی۔ لیکن بہت جلد اس رجحان نے آخری سانسیں لینا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کی جگہ نئے رجحان نے لے لی تھی۔ ۱۹۸۰ء کے بعد مابعد جدیدیت نے جدیدت کو Replace کر دیا۔ بہت سی چیزیں تبدیل ہوئیں۔ زمانہ تبدیل ہوا حالات اور موضوعات تبدیل ہوئے۔ مابعد جدیدیت نے ادب کے ایک بڑے حصہ کو متاثر کیا اور اس کی نمائندگی کی۔ آل احمد سرور اپنے ایک مضمون میں کہتے ہیں:

''قدرتی طور پر ادب میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ایک میلان زور پکڑتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ پھر اس کا رد عمل شروع ہوتا ہے اور دوسرا میلان سامنے آتا ہے۔ یہ گویا ادکا قانون ہے کہ جو نئی رو آتی ہے وہ صرف پچھلی رو کی بازگشت نہیں ہوتی

بلکہ کچھ اور نئی چیزیں لیے ہوتی ہے۔''

(آل احمد سرور، ایوان اردو، اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۸)

آل احمد سرور کی بات میں سچائی لگتی ہے کہ ہر میلان اور رجحان عروج کے بعد زوال پذیر ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ کہہ سکتے ہیں کہ جدید ترقی پسندی کی ضرورت کیوں؟ اس کا سیدھا سادہ جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ مابعد جدیدیت آخر کب تک؟ کیا ادب میں مابعد جدیدیت کے بعد کوئی رجحان آئے گا یا نہیں؟ کسی نئے رجحان کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ بہت غور کرنے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ تو جدید ترقی پسندی کا عہد ہے۔ جدید ترقی پسندی میں بہت سی تحریکیں اور رجحانات آپس میں جمع ہو گئے ہیں۔ مثبت قدروں نے سر ابھارا اور نئے حالات کے مطابق ادب کو ڈھالنا اور پرکھنا شروع کر دیا۔ یوں تو جدید ترقی پسندی کی ابتدا قومی سطح پر ۱۹۹۲ء اور بین الاقوامی سطح پر ۲۰۰۱ء میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اس نئے رجحان نے آہستہ آہستہ فطری طور پر ادب میں اپنی جگہ بنانی شروع کی اور ۲۰۱۰ تک اس نے ادب میں خود کو مستحکم کر لیا۔ اس رجحان میں اقلیتی ڈسکورس اور دلت ڈسکورس کی شروعات شدومد کے ساتھ ہوئی۔ اظہار خیال کے نئے نئے طریقے سامنے آنے لگے۔ جس میں فکشن لکھنے کا ایک نیا طریقہ 'کولاژ' ٹیکنیک سامنے آیا۔ یہ سبھی نئی صدی کی دین ہے۔ اس نئی صدی میں آئی۔ ٹی ایک نئے چیلینج کے طور پر اردو کے سامنے تھا اور ہے۔ ایسے میں ایک نئے رجحان کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ جدید ترقی پسندی نے ادب کے اس خلاء کو پر کرتے ہوئے خود کو ثابت کیا۔

جدید ترقی پسندی کیا ہے؟ اس کی ضرورت کیوں پڑی؟ اس کے خدوخال کیا ہیں؟ یہ کب شروع ہوئی؟ ان سوالوں کے تفصیلی جواب کے لئے ہمیں ماضی کے اوراق پلٹنے ہوں گے۔ اردو میں بہت سی تحریکات کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں۔ مثلاً بھگتی تحریک، صوفیا کی تحریک، ابہام کی تحریک، اصلاحِ زبان کی تحریک، فورٹ ولیم کالج کی تحریک، علی گڑھ تحریک، انجمنِ پنجاب کی تحریک، اقبال کی تحریک، رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقہء ارباب ذوق کی تحریک، تحریکِ ادب اسلامی، پاکستانی ادب، ارضی و ثقافتی تحریک (انور سدید کے مطابق)۔ ان سبھی تحریکات کے اردو زبان و ادب نے بہت سے اثرات قبول

کئے۔ان سب کو اگر ہم تحریک مان بھی لیں تو ان کے مقاصد اور اثرات کے دائرہ کار پر الگ الگ کتابیں تحریر کی جا سکتی ہیں۔یہ سبھی تحریکیں اردو زبان و ادب کو پختہ، مستحکم، پائیداراور ہر دلعزیز بنانے کے لئے اپنے وقت پر کوشاں رہیں۔دراصل تحریک جمود کے توڑنے کا نام ہے۔ادب ایک ایسا سیال ہے، جسے ہر وقت کسی تحریک یا رجحان کی ضرورت ہوتی ہے۔اگر آپ بغور مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ اردو جب سے وجود میں آئی ہے کسی نہ کسی تحریک ،رجحان یا نظریے کے زیر اثر رہی ہے۔حقیقت میں زبان ہمیشہ حرکت پذیر ہوتی ہے۔اسی لئے زبان سے جو ادب پیدا ہوتا ہے، وہ بھی ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے۔اسی لئے ادب میں کوئی تحقیق حتمی نہیں ہوتی۔ادب میں دوام صرف تغیر و تبدل کو حاصل ہے۔جدید ترقی پسندی کے رجحان کو سمجھنے کے لئے ماضی قریب کی تحریک اور رجحانات کو سمجھنا ضروری ہے۔

ترقی پسند تحریک

ترقی پسند تحریک کی ابتدا تو بہت پہلے ''انگارے'' کی اشاعت (۱۹۳۲) سے ہی ہو چکی تھی، لیکن اس کا باضابطہ آغاز لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام اور لکھنؤ میں اس کی پہلی کانفرنس (۱۹۳۶) سے ہوا۔جس کی صدارت معروف فکشن نگار پریم چند نے کی تھی۔اور ترقی پسند تحریک کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے ایک خطبہ دیا تھا۔خطبہ تو کافی طویل تھا مگر اپنے اندر بہت سی نئی باتیں لئے ہوئے تھا۔ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ ہونے والے ادبا و شعرا کے لئے راستہ دکھانے والا تھا۔خطبے کا ایک چھوٹا سا اقتباس دیکھیں:

> ''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قت اور حرکت پیدا نہ ہو، ہمارا جذبۂ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کا سچا استقلال پیدا نہ کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔''

(منشی پریم چند، اردو ادب کی مختصر تاریخ، انور سدید، ص ۴۲۷، مطبوعہ

عالمی میڈیا، دہلی، ۲۰۱۴)

پریم چند کا یہ جملہ تو بہت مشہور ہوا۔ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔'' اس طرح کے جملے پریم چند کے خطبے میں بھرے پڑے تھے۔ یہ دراصل نئے ادیبوں کو سمجھانے کے لئے تھا کہ اب تک حسن کا معیار دولت میں تولا جا تا تھا۔ ہمارا سچا فنکار بھی امیروں کا اسیر تھا۔ سڑک پر پتھر توڑنے والی عورت بھی حسین ہے، محلوں میں رہنے والی دوشیزہ ہی حسین نہیں ہے۔ بلکہ محنت مزدوری کرنے والی عورت، محلوں میں رہنے والی دوشیزہ سے کئی گنا زیادہ حسین ہے۔

تحریک کے بانی سجاد ظہیر، بنّے بھائی نے اس تحریک کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔ انہوں نے لندن میں دورانِ تعلیم ہی دنیا میں ہو رہی سیاسی اور ادبی بیداری کے اثرات قبول کرنے شروع کر دیے تھے۔ یہی نہیں انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی تھی۔ انجمن کی پہلی کانفرنس بھی لندن میں ہوئی اور پھر ہندوستان کا رخ کیا۔ محنت و مشقت کے بعد بہت سے ادبا و شعرا کو اپنا ہم خیال بنایا۔ تحریک کا جو مینی فسٹو لندن میں انہوں نے اور ان کے ساتھیوں (ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا، ڈاکٹر دین محمد تاثیر) نے بنا یا تھا، کو عام کرنا شروع کیا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے پریم چند نے اس پر لبیک کہا۔ بعد میں ایک گروپ بنتا گیا۔ بقول مجروح سلطانپوری

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ایک کے بعد ایک اردو ہی نہیں ہندوستان کی کئی زبانوں کے ادبا و شعرا سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ ہوتے گئے۔ اس طرح ہندوستان میں ایک انقلابی تحریک، شروع ہوگئی۔ اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ ہر طرف اسی کا شور ہونے لگا۔ لوگ اس میں شامل ہونا اپنی قسمت تصور رنے لگے۔ پاکستانی نقاد انور سدید اپنی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں لکھتے ہیں۔:

''رومانیت اور حقیقت نگاری کی تحریکیں ایک طویل عرصے تک الگ الگ جہت میں سفر طے کرتی رہیں۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو یہ دونوں دھارے آپس میں مل گئے۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک نے اقبالؔ کی رومانیت سے تخلیقی قوت اور جوشؔ کی رومانیت سے بغاوت کا جذبہ حاصل کیا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری نے اسے زمین کی طرف متوجہ کیا اور ان سب کے امتزاج کو بھی نوعِ انسان کی بہبود میں صرف کرنے کے لئے ادیب کی فکر کو داخل سے خارج کی طرف پیش قدمی کی راہ دکھائی۔''

(انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص۔ ۴۶۶، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۴)

انور سدید کی بات صحیح ہے کہ اس تحریک نے معاشرے اور خارج کی بات کی۔ اس میں کئی دھارے آ کر مل گئے۔ اقبال کی رومانیت سے تخلیقی قوت، جوش کی رومانیت سے بغاوت اور پریم چند کی حقیقت نگاری، سب اس میں مل گئے۔ انور سدید اپنی کتاب ''اردو ادب کی تحریکیں'' میں ترقی پسند تحریک کے تعلق سے مزید وضاحت سے لکھتے ہیں۔ وہ اس کا موازنہ علی گڈھ تحریک سے بھی کرتے ہیں لیکن علی گڑھ تحریک نے ادب کو اس تحریک کے مقابلے، بڑے اور وسیع علاقے میں متاثر نہیں کیا۔ اور اختر حسین رائے پوری نے ادب کے تعلق سے جو سوالات قائم کئے تھے، ان کا جواب سید سجاد ظہیر نے اس تحریک کے ذریعہ عملی طور پر دیا۔

''ترقی پسند تحریک اردو ادب کی اولین تحریک تھی جس کے لئے ایک باضابطہ منشور تحریر کیا گیا۔ علی گڑھ تحریک ایک فعال تحریک تھی اور اس نے ادب کو شدت سے متاثر کیا۔ تاہم اس تحریک نے جماعتی انداز میں ادب کی تخلیق کے بارے میں کوئی فیصلہ نافذ نہیں کیا۔ بیسویں صدی کے ربعِ چہارم سے پہلے ادب کی تخلیق ایک انفرادی عمل تھا اور ادبا کی پہچان ان کے منفرد ادبی کارناموں سے ہوتی تھی۔ ڈاکٹر

اختر حسین رائے پوری نے اردو ادب کو جن مسائل سے آشنا کرایا
ان کے حل کے لئے اجتماعی کاوش کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک با
ضابطہ تنظیم کی ضرورت لاحق ہوگئی اور اسے سید سجاد ظہیر نے معرض
وجود میں لانے کے لئے عمدہ خدمات سرانجام دیں۔''

(انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں ص، ۴۷۱، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۴)

منظر اعظمی کا شمار اردو کے معتبر ناقدین میں ہوتا ہے۔ انہوں تحریکات و رجحانات پر کافی تحقیق کی ہے۔ ان کی کتاب ''اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ'' اردو اسکالرز اور طلبہ کے درمیان بہت مقبول ہے۔ آپ نے اپنی کتاب میں رویہ، رجحان، تحریک اور دبستانوں وغیرہ پر اچھی خاصی بحث کی ہے۔ اور بڑی وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ علیگڑھ تحریک کے بارے میں آپ کی رائے مدلل اور مستحکم ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''اردو ادب میں علی گڑھ تحریک کے بعد یہ دوسری اہم اور سب سے
بڑی اور سب سے زیادہ منظّم تحریک تھی۔ جس کی کوششیں شعوری اور
مقصد واضح تھا۔ ادبِ لطیف کے رجحان اور حسن پرستی کی شدت کے
خلاف یہ ایک طرح کا شدید ردعمل تھا۔ اس تحریک نے علی گڑھ
تحریک کی عقلیت، مادیت اور اجتماعیت کو ایک نئی شکل دی۔ علی گڑھ
تحریک کے افادی اور مقصدی ادب کے نقطۂ نظر کو جدلی مادیت یا
اشتراکی اور سوشلسٹ نظام فکر سے جوڑ دیا گیا۔ فطرت پرستی کے
رجحان میں حقیقت نگاری کا رنگ بھرا گیا۔ اور ان تمام قدیم اور بعض
فرسودہ قدموں سے بغاوت کا اعلان کیا گیا جو ترقی پسند نہیں تھیں۔
علی گڑھ تحریک میں بغاوت کا رجحان مدہم تھا۔ مگر اس تحریک سے ہر
وہ شخص وابستگی محسوس کرنے لگا جو کسی نہ کسی جہت سے سماج، سیاست
، مذہب اور ادب کے پرانے نظام فکر سے باغی تھا۔ اس کی رو

بغاوت آہنگ تھی۔ دراصل اس تحریک کا مسلک ہی اشتراکی اور عوامی انقلاب تھا۔''

(اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، منظر اعظمی، ص ۳۶۸، یوپی اردو اکادمی، ۱۹۹۶)

انور سدید اپنی ایک اور کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' میں اس تحریک کے مقاصد، دائرہ کار اور اثرات کے تعلق سے کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ادب کے بدلتے موضوعات اور عام لوگوں تک اس کی پہنچ کو بھی نشان زد کیا ہے۔ ساتھ ہی اس تحریک کے منفی پہلوؤں پر بھی بات کی ہے۔ آپ بھی دیکھیں۔

''ترقی پسند تحریک ایک مؤثر اور پر جوش سماجی تحریک تھی، اس تحریک نے معاشی نا انصافی کے دور میں انسانیت اور مساوات کو مذہب کا درجہ دیا اور ادیب کو سائنسی اور تجزیاتی نقطۂ نظر سے آشنا کیا۔ اس تحریک نے استحصال کے خلاف سماجی انصاف کا احساس پیدا کیا۔ رجائیت اور امید کی شمع روشن کی۔ عام انسان محنت کش اور کسان کو ادب کا موضوع بنایا۔ نئے موضوعات کے لئے نئی لفظیات وضع کی ۔لیکن اس تحریک کے سب اثرات مثبت نہیں تھے۔ اس تحریک نے مذہب کی نفی کر کے فرد سے روحانی طمانیت چھین لی تھی، چنانچہ فرد نہ صرف پیداواری قوتوں اور مادے کا غلام بن گیا بلکہ اشتراکی نظریئے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر بھی مجبور ہو گیا۔''

(انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۴۲۸، مطبوعہ، عہ عالمی میڈیا، دہلی، ۲۰۱۴)

پروفیسر گوپی چند نارنگ موجودہ عہد کے اعلیٰ محقق اور مستند ناقد کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ آپ کا مقام جدید اردو تنقید میں بہت منفرد ہے۔ آپ نے مابعد جدیدیت، ساختیات، پس ساختیات اور نو آبادیاتی تصورات کو نہ صرف متعارف کروایا بلکہ اسے عام کرنے کی بھی حتیٰ الامکان کوشش کی۔ مابعد جدیدیت کا تو آپ کو امام تسلیم کیا جاتا

ہے۔آپ کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ترقی پسندی کے ایک ایک پہلو پر آپ کی کافی گہری نظر تھی۔ترقی پسندی کے بعد کے حالات اور جدیدیت کے رجحان کا ادب پر چھا جانا،سب آپ کی نظر میں ہے۔اسی لئے آپ کی رائے بہت معنی رکھتی ہے۔آپ ترقی پسند تحریک کے تعلق سے اپنا نظریہ رکھتے ہیں۔

''اس پس منظر میں دیکھیں تو نئے فلسفے کی رو سے سابق کی وہ تمام تحریکیں اور نظریے خواہ وہ کتنے باغیانہ اور انقلابی کیوں نہ رہے ہوں،وہ سب کے سب بشمول جدیدیت وترقی پسندی جو اپنی ضابطہ بندی کرتے ہیں یا فارمولا سازی کرتے ہیں یا لائحہ عمل دیتے ہیں، کسی نہ کسی منزل پر ادعائیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔اس لئے تخلیقیت اور آزادی کے منافی ہیں۔اس کی سب سے بڑی مثال جدلیت اساس مارکسیت تھی جو اسٹالینیت کی زد میں آکر آزادی دشمن اور بے روح ہوتی چلی گئی۔اردو میں ترقی پسندی نے جو اصلاً باغیانہ تحریک تھی،جب ضابطہ بندی اور سکہ بندی کا حصار کھینچا،تو گویا خود ہی ادعائیت کے خنجر سے خودکشی کر لی۔''

(ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت ، گوپی چند نارنگ،ص ۵۸۹، ایڈ شاٹ پبلیکیشنز،ممبئی ۲۰۰۴)

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اردو کے اچھے ناقد تسلیم کئے جاتے ہیں۔انہوں نے ادب کے مختلف موضوعات پر ہماری رہنمائی کی ہے۔وہ ایک جدید لب و لہجے کے شاعر بھی ہیں ۔جدید شاعری کا نقطہء آغاز ناصر کاظمی ،خلیل الرحمن اعظمی،ابن انشاء،وغیرہ کو مانا جاتا ہے۔ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کی کتاب''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔یہ کتاب ادب کے ہر طالب علم کے لئے ناگزیر ہے۔سب کو اس مطالعہ کرنا چاہئے۔ایک اندازے کے مطابق اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی دس کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کے تعلق سے یہ کتاب حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔اس کتاب میں ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے اسباب وعوامل، ابتدائے، انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام، اس تنظیم کا پہلا اجتماع، لندن اور لکھنو کی تفصیل، تحریک کا منشور، لائحہ عمل، اس کے تحت لکھا جانے والا ادب، نظم، نثر، تنقید، پر بھرپور تبصرہ۔الغرض ترقی پسند تحریک کے تعلق سے ہر معلومات آپ کو اس کتاب میں مل جائے گی۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ترقی پسند تحریک کے تعلق سے لکھتے ہیں۔

> ''مارکس اور اینگلز کی تحریروں کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے انھیں معلوم ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ادب کے مطالعے کے لئے تاریخی شعور کو ضروری سمجھا۔ان کا خیال ہے کہ ماضی کے ادیبوں کو ان کے اپنے تاریخی وسماجی ماحول میں رکھ کر دیکھنے سے ہی ان کے موضوعات اور ان کے پیش کردہ نقطۂ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے اور ان کے کارناموں کے ساتھ انصاف کیا جا سکتا ہے جو اپنے زمانے میں ترقی پسند تھے اور جن میں فن کار نے اپنے شعور و ادراک اور فن کارانہ خلوص سے حقائق کی نفی کرنے کے بجائے ان کا عرفان حاصل کیا ہے اور انھیں اثباتی انداز میں پیش کر کے حق وصداقت کی طرف رہنمائی کی ہے۔اس طور پر یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پسندی کا تصور نہ تو جامد ہے اور نہ آج اور صرف آج کی پیداوار ہے بلکہ یہ ایک مسلسل و نامیاتی عمل ہے جو ماضی کی بہترین روایات اور نئے دور کے مطالبات کو ہم آہنگ کر کے ایک 'زندہ رود' کی شکل میں جاری رہتا ہے۔''

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ص ۱۲۔۱۳ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲)

اپنی کتاب میں ایک جگہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس تحریک کے شروع ہونے کے

اسباب اور عالمی سیاسی بیداری کی وجوہات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

''ان بیدار اور حساس نوجوانوں کو اس زمانے کے سیاسی مسائل نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ نازی جرمنی میں ہٹلر نے ایک ایک کر کے تہذیب و تمدن کی اعلیٰ اقدار پر حملہ کر دیا اور اپنے ملک کے اعلیٰ درجے کے ادیبوں، شاعروں، سائنسدانوں اور دانشوروں کو قید کر لیا یا جلا وطن کر کے دور دراز مقامات پر بھیج دیا۔ ٹامس مان اور ارنسٹ ٹولر جیسے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیب، ہابر جیسا آرٹسٹ اور آئن سٹائن جیسا سائنسداں جلا وطن ہو کر بے سروسامانی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان ادیبوں کی گرفتاری کے بعد یورپ کے روشن خیال اور ترقی پسند ادیبوں میں فاشزم کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور نہ صرف یورپ بلکہ امریکہ کے اہل علم اور دانشور بھی متحد ہو کر ان تمام عوامی تحریکوں میں شامل ہونے لگے جو اس رجعت پسند اور انسانیت دشمن طاقت کے خلاف نبرد آزما تھیں۔''

(خلیل الرحمٰن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص ۲۹، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۲)

\پروفیسر قمر رئیس سے کون واقف نہیں ہوگا۔ قمر رئیس ترقی پسند تحریک کے ابتدائی مصنفین کے بعد اس کی کمان سنبھالنے والے ناقد تھے۔ آپ نے سجاد ظہیر (بانی ترقی پسند تحریک) کے ساتھ رہ کر تنظیم کی ہر باریکی سیکھی۔ اور ترقی پسند تحریک کا علم مخالف ماحول میں بھی بلند کیا۔ آپ نے دنیا کے ایک بڑے حصے کا سفر کیا۔ اپنی تحقیق و تنقیدات میں ترقی پسند نظریے کو عام کیا۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں ترقی پسند تنظیم کا ڈھانچہ از سر نو کھڑا کیا۔

اپنے ایک مضمون میں پروفیسر قمر رئیس نے عالمی سطح پر ترقی پسند تحریک کے شروع ہونے کے اسباب و علل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہمارے جو نوجوان لندن میں زیر

تعلیم تھے،انہوں نے عالمی سطح پر ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلی کو محسوس کیا۔ پروفیسر قمر رئیس کے خیالات ملاحظہ کریں۔

''تیزی سے بدلتے ہوئے بین الاقوامی حالات اور آزاد ہندوستان میں زندگی کے نئے تقاضے نئے خطوط پر ادیبوں کی تنظیم کا مطالبہ کر رہے تھے۔نوجوان ادیب جدیدیت کی تحریک سے (جس کا مقصد ترقی پسند نظریہ ادب اور افکار کی بیخ کنی تھا) مایوس ہو گئے تھے۔ان کے سامنے نئے چیلنج، نئے سوالات، نئی ذمہ داریاں تھیں اور ایک ایسے فورم کی تلاش جہاں وہ ان کے بارے میں کھل کر گفتگو کر سکیں۔''

(پروفیسر قمر رئیس،مقدمہ،ترقی پسند ادب)

ترقی پسندی کے تعلق سے بہت سارے لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اسے دیکھا ہے۔نئی نسل میں ابھی کچھ لوگ ہیں، جو یہ مانتے ہیں کہ ترقی پسندی صرف اردو کی تحریک نہیں بلکہ یہ ایک سوچ ،فکر اور طرزِ حیات ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو ہمیں فن پارے کو پرکھنے کا طریقہ بھی بتلاتا ہے۔ یہ انسانی استحصال کے خلاف احتجاج کی آواز ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے اپنی ساری زندگی نئی نئی تھیوریز کے مطالعے میں وقف کر دی ہے۔وہ کسی بھی تحریک یا رجحان میں موجود عناصر اور ان کے اثرات کو تلاش کرتے ہیں۔ان کی تنقید سے متعلق کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔آج کل وہ مابعد جدیدیت کے زائل ہوتے اثرات پر قلم اٹھا رہے ہیں۔نئی صدی میں جدید ترقی پسندی کی شروعات پر غور و فکر کر رہے ہیں۔اس سلسلے میں ان کے کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔قدوس جاوید کو موجودہ عہد کے معتبر نقادوں میں شمار کیا جاتا ہے۔وہ ترقی پسندی کو اپنے زاویے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

''ترقی پسندی ؛سوچ اور فکر کے اس مخصوص و منفرد زاوئے سے عبارت ہے جس کا مقصد عالم انسانیت کی پس ماندگی اور 'استحصال'

کے 'نار' کو 'مساوات' اور 'منصفی' کے 'نور' میں تبدیل کرنا ہے۔ اسی لئے ترقی پسندی کو، صحیح خطوط میں، انسانی سماج کے مقدر کی تعمیر کا فلسفہ بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سماجی زندگی اور زمانہ کی بدلتی ہوئی قدروں کے تجزیاتی اور تعمیری شعور کا دوسرا نام ترقی پسندی ہے۔ لیکن یہ بھی دھیان رہے کہ ماضی کے اکتسابات، حال کی تحلیل اور مستقبل کے امکانات کی آگہی کا حامل زرخیز شعور ہی عصری حقائق اور مسائل کی کے حوالے سے ایسے معیاری، اقداری اور فکری نظام کی تشکیل کرسکتا ہے جو سماج کو وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے سانچوں میں ڈھالنے کا سبب بن سکے ''

(نئی ترقی پسندی۔ پروفیسر قدوس جاوید)

پروفیسر علی احمد فاطمی کسی تعارف کے محتاج نہیں، ترقی پسندی کے فی زمانہ ہندوستان میں علمبردار کے طور پر آپ کو پوری اردو دنیا جانتی ہے۔ آپ نئی نسل کے ایک ممتاز ترقی پسند ناقد ہیں۔ آپ کے مضامین ومقالات آج ہندو پاک کے معتبر ادبی رسائل وجرائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ آپ کی کئی کتابیں، آپ کے ترقی پسند نظریے کو سامنے لاتی ہیں۔ اپنی ایک کتاب '' ترقی پسند تحریک سفر در سفر'' میں آپ نے ترقی پسند تحریک کے مختلف پہلوؤں پر مدلل بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''بلا شک وشبہ ترقی پسند تحریک نہ صرف اردو زبان وادب کی بلکہ پورے ہندوستانی زبان وادب کی سب سے بڑی ادبی تحریک ہے۔ کچھ لوگ علی گڑھ تحریک یا سرسید تحریک کو بھی بڑی تحریک کہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک بھی انیسویں صدی کی بڑی تحریک تھی۔ لیکن دونوں میں فرق ہے۔ علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر سماجی تحریک تھی۔ اسی ضمن میں تعلیمی و اصلاحی بھی۔ جس نے براہِ راست شعروادب کو متاثر کیا۔ اس کے برعکس ترقی پسند تحریک ادبی و

ثقافتی تحریک تھی جس نے ملک و معاشرہ کو متاثر کیا۔ دونوں ہی
صورتوں میں ادب وسماج کے گہرے رشتوں پر روشنی پڑتی ہے۔''

(ترقی پسند تحریک سفر در سفر، علی احمد فاطمی، ص۔۵، نیا سفر الہ آباد۔۲۰۰۶)

جدیدیت

جدیدیت کیا ہے۔؟ تحریک یا رجحان؟ تو اس بارے مختلف آراء ہیں۔کوئی اسے تحریک مانتا ہے تو کوئی اسے رجحان کا نام دیتا ہے۔اس بارے میں اختلاف ہے۔دراصل جدیدیت کا دائرہ تحریک جیسا وسیع تھا، مگر اس میں باضابطہ کوئی تنظیم ترقی پسند تحریک کی طرح نہیں تھی اور نہ ہی کوئی منشور تھا جس پر اس کے حامی مصنف عمل کرتے۔لہٰذا جدیدیت کو تحریک کہنا، مناسب نہیں۔ہاں یہ ایک مضبوط رجحان کے طور پر سامنے آئی اور اس نے ایک مضبوط و مستحکم تحریک کی جگہ لے لی۔ایک زمانہ تھا کہ اسے ترقی پسندی کے خلاف مانا جا رہا تھا۔مگر بعد میں اسے ترقی پسندی سے انحراف سمجھا جانے لگا۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ جدیدیت کو ہندوستان میں متعارف کرانے کا سہرا شمس الرحمٰن فاروقی کے سر ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی اردو کے فی زمانہ ایک بڑے ناقد و محقق ہیں۔انہوں نے اپنی صلاحیتوں اور علمیت سے خود کو ثابت کیا۔جدیدیت کے سب سے بڑے علمبردار ہونے کے ناطے شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے عام کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔اس کی وضاحت و توضیح کے لئے آپ نے بہت سے کام کئے۔شمس الرحمٰن فاروقی جدیدیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''جدیدیت کا مسلک انسان دوستی اور انسان مرکزیت ہے۔لیکن
جدیدیت ان فلسفوں کے خلاف ہے جو بشر دوستی کے نام پر انسانی
آزادی کا استحصال کرتے ہیں۔جدیدیت ان تحریکوں کے خلاف
ہے جو نام نہاد امن و آشتی کی علم بردار ہیں لیکن ادیب کی آزادی پر قد
غن لگاتی ہیں۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، جدیدیت کل اور آج، ص ۴۲، نئی کتاب پبلشرز، نئی

دہلی، ۲۰۰۷)

شمس الرحمٰن فاروقی خود کا موقف سمجھانے اور جدیدیت کو ترقی پسندی کی مخالف تحریک کے سلسلے میں اپنی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''جدیدیت کو ترقی پسندی کی مخالف تحریک کہنا غلط ہے۔ جدیدیت ایک رجحان ہے اور اس کی فکری بنیادیں ترقی پسندی سے مختلف ہیں۔ لیکن یہ ترقی پسندی کی ضد میں نہیں، بلکہ آزاد ادبی وجود کے طور پر قائم ہوئی ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، جدیدیت کل اور آج، ص ۴۲، نئی کتاب پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷)

دراصل جدیدیت کا پورا رجحان ابتدا میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مرہون منت ہے۔ فاروقی نے اس میں ادب کی تمام چیزوں کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جدیدیت کے تحت ادب کے معیار طے کرنے کی کوشش کی۔ لمبی چوڑی تحریر اگر بغیر معیار کے سامنے ہو تو آپ اس کو کیسے پرکھیں گے۔ ادب کو کیسے پرکھیں گے۔ شعر، غزل یا کوئی ادبی تحریر کو کن معیارات پر جانچا جائے گا۔ ان تمام امور میں جدیدیت کس طرح اپنا کردار ادا کرے گی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے تفصیل ان سب باتوں پر اظہار کیا ہے۔

''جدیدیت کا وہ یہ ہے کہ شعر کو، ادب کو، سمجھنے سمجھانے، اس کو قائم کرنے، اپنے ذہن میں اس کو پیدا کرنے اور زندہ رکھنے کے لیے پہلا معیار یہ ہونا چاہئے کہ شعر کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ ادبی طور پر وہ شعر کے تقاضے پورا کرتا ہے یا نہیں؟ فن کے جو تقاضے ہیں وہ ادبی طور پر پورے ہوں۔ اس طرح نہیں کہ سیاسی طور پر، مذہبی طور پر، فلسفے کے طور پر، کسی سماجی پروگرام کے طور پر یا کسی اور طرح سے۔ اب تو خیر کم ہیں مگر یہ اس زمانے کے فیشن تھے کہ صاحب سماجی تبدیلی، سماجی شعور، سیاسی ہنگامے اور طبقاتی کشمکش۔ یہ اور وہ۔ تنقید

کے، جناب، صفحات کے صفحات کے صفحات پڑھ ڈالیے آپ، معلوم ہوگا کہ قدم آگے بڑھا ہی نہیں اور آپ بار بار طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اس لیے پہلا اصول یہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ شعر یا فن یا ادب، یہ انسان کے باطن کا اظہار ہے اور اس کے کچھ معیارات ہیں جو پہلے تو ادبی اصولوں کے تحت ہوں گے جن کی روشنی میں آپ یہ طے کریں گے کہ کوئی چیز ادب ہے کہ نہیں۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی، جدیدیت کل اور آج، ص ۱۹، نئی کتاب پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۷)

وارث علوی کو کون نہیں جانتا؟ اردو میں فکشن تنقید ہو یا تنقید کے کسی دبستان کا ذکر ہو، وارث علوی نے بے باک انداز میں تعریف و توصیف کے علاوہ زبردست تنقید کی ہے۔ جدیدیت پر بھی وارث علوی نے کھل کر بات کی ہے۔ خاص کر جدیدیت نے اردو فکشن پر اپنے جو اثرات مرتب کئے، ان کو وارث علوی نے ادب کے معیاروں پر دیکھنے کی سعی کی ہے۔ دراصل وارث علوی کا کسی بھی فن پارے کو دیکھنے کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ وہ کبھی بھی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے ہیں، نہ ہی کوئی خوف انہیں اپنی بات کہنے سے باز رکھتا ہے۔ دیکھیں وارث علوی جدیدیت اور اس کے زیر اثر جو ادب خاص کر فکشن تحریر ہو، کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

''علامتی افسانہ کے وجود کا کوئی جواز ہوسکتا ہے تو یہی ہے کہ اس کی زندگی کے ترجمانی میں دلچسپی نہیں کیوں کہ ایسی ترجمانی ممکن نہیں۔ کیوں کہ ہم جانتے ہی نہیں کہ خارجی حقیقت کیا ہے؟ کیوں کہ فلسفیوں نے بتایا ہے کہ خارجی حقیقت جیسی کوئی چیز نہیں۔ اسی لیے علامتی افسانہ میں آپ کو سانپ، بچھو، چھپکلیاں، صحرا، جنگل اور پہاڑ مل جائیں گے، انسانی آبادیاں نہیں ملیں، وہ معاشرتی نظام نہیں ملے گا جو فرد کا فرد سے رشتہ قائم کرنے سے وجود میں آتا ہے۔''

(وارث علوی، جدید افسانہ اور اس کے مسائل، ص ۹۱، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۰)

پاکستان میں اردو ادب اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ وہاں تنقید و تحقیق کا معاملہ ہندوستان سے مختلف ہے۔ جدیدیت نے پاکستان میں بھی ایک فضا ہموار کی۔ کچھ ناقدین حمایت میں سامنے آئے تو کچھ نے مخالفت بھی کی۔ شہزاد منظر پاکستان کے ایک معروف فکشن نگار اور ناقد ہیں۔ شہزاد منظر کا ادب کو پرکھنے کا اپنا طریقہ ہے۔ انہوں جدیدیت کو بھی الگ طریقے سے لیا۔

> ''جدیدیت ایک تحریک یا مکتبہ فکر نہیں بلکہ ایک اضافی قدر ہے۔ نہ یہ ترقی پسندی کی توسیع ہے۔ نہ وجودیت ہی کی تعبیر، نہ رومانیت کی توسیع، نہ خلاف رومانیت بلکہ آج کے انسان کی ذات اور کائنات کو سمجھنے کی کوشش ہے۔''

(شہزاد منظر، جدید اردو افسانہ، ص ۴۴۔۴۵، مطبوعہ ۱۹۸۸)

پروفیسر لطف الرحمٰن بہار سے تعلق رکھنے والے ایک اچھے ناقد ہیں۔ آپ کا مطالعہ بہت عمیق تھا۔ تنقید کے مختلف رجحانات اور تحریکوں پر آپ کا کافی گہرا مطالعہ تھا۔ اردو میں وجودیت کے رجحان کو متعارف کرانے والے بھی وہی تھے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے جدیدیت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ جدیدیت کو انسان کی داخلی دنیا کی کیفیت سے مشابہ مانتے تھے۔ وہ اسے وجودیت کی ہی توسیع مانتے تھے۔

> ''جدیدیت فرد کی داخلی، جلاوطنی و موضوعی بے پناہی کی ترجمانی و تنقید ہے جس کے نتیجے میں فرد تنہائی، الجھن، بے گانگی، اجنبیت، اکیلا پن، کلبیت، بوریت، یکسانیت، بے معنویت، مہملیت، جرم، بیخوفی، بے سمتی، بے یقینی، نا امیدی، بے تابی، اکتاہٹ، بیزاری اور متلی کی کیفیت سے دو چار ہے۔ ان رجحانات کے اعتبار سے جدیدیت فلسفۂ وجودیت کی توسیع ہے۔'' (لطف الرحمٰن، اردو کا

افسانوی ادب، بہار اردو اکادمی، ص ۱۴۰، مطبوعہ، ۱۹۸۷)

جدیدیت کے نشیب و فراز کو ہم نے قریب سے دیکھا۔ اس کے تحت لکھے گئے ادب کا بھی ہر زاویے سے مطالعہ کیا۔ یہ رجحان ۱۹۶۰ کے آس پاس شروع ہوا اور دس بارہ برس اپنے ارتقا کی مختلف منزلیں طے کرتا رہا۔ ۱۹۷۰ کے بعد ہی اردو والوں میں اس کے تئیں بے زاری اور اکتاہٹ پیدا ہونے لگی۔ اور مابعد جدیدیت نے اس کی جگہ لے لی۔ مابعد جدیدیت کیا ہے؟ اسے رجحان کہیں گے یا رویہ۔ مابعد جدیدیت کا نظریہ کیا ہے؟ اس کے اصول کیا ہیں؟ یہ ادب کو کن معیاروں اور اصولوں پر جانچتا پرکھتا ہے۔ آیئے ایک نظر مابعد جدیدیت پر ڈالتے ہیں۔

مابعد جدیدیت

مابعد جدیدیت کو ہندوستان خاص کر اردو میں متعارف کرانے کا سہرا پروفیسر گوپی چند نارنگ کے سر ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ درس و تدریس سے وابستہ تھے۔ ان کی نظر ادب کے ہر نشیب و فراز پر تھی۔ حقیقت پسندی ہو یا رومانیت، ترقی پسندی ہو یا جدیدیت، انہوں سب کا مطالعہ کیا تھا۔ ترقی پسندی کے ارتقاء و عروج کو بھی دیکھا اور آخری سانس لیتے ہوئے بھی دیکھا۔ جدیدیت کو ادب کے بڑے طبقے میں پھیلتے دیکھا اور جدیدیت کا زوال بھی دیکھا۔ ایسے میں وہ اردو ادب کی رگ رگ سے واقف تھے۔ وہ جدیدیت کے زوال پذیر ہونے کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے مابعد جدیدیت کا اردو ادب میں ڈول ڈال دیا۔ اس کو ایک رجحان کے طور پر عام کرنا شروع کیا۔ اس کے نظریے اور اس کے دائرہ کار کو کھول کر سمجھایا۔ کسی ایک نظریے کی نہیں بلکہ اس عہد کو انہوں نظریہ ہائے ادب سے تعبیر کیا۔ گوپی چند نارنگ کے ایک مضمون کا اقتباس دیکھیں۔

> ''مابعد جدیدیت نہ تو وحدانی ہے اور نہ یک نوعی۔ ترقی پسندی یا جدیدیت کا بنیادی محرک وحدانی نظریۂ ادب تھا جس کو دو اور دو چار کی زبان میں بیان کرنا ممکن تھا۔ جدیدیت کے بعد جو فلسفۂ ادب سامنے آیا ہے اور ادبی تھیوری میں جو ترقی ہوئی ہے، اس کی کوئی نظیر

سابقہ زمانوں میں نہیں ملتی۔ یعنی موجودہ زمانہ کسی ایک نظریۂ ادب کا نہیں نظریہ ہائے ادب کا ہے: ساختیات ہو یا پس ساختیات، مظہریت ہو یا قاری اساس تنقید، تفہیمیت ہو یا ردتشکیل، نسوانیت ہو یا نئی تاریخیت، یہ سب ادبی نظریے کم وبیش اسی زمانے میں سامنے آئے ہیں یا ادب کی دنیا میں ان کا عمل دخل جدیدیت کے بعد ہوا ہے۔''

(ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت، گوپی چند نارنگ، ص ۵۸۶، ایڈ شاٹ پبلیکیشنز، ممبئی ۲۰۰۴)

نظام صدیقی نے مابعد جدیدیت کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے جدیدیت کے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ وہ مابعد جدیدیت کے اسلوب اور موضوع کے معاملے ہوں یا مابعد جدیدیت کے اپنے سے قبل کے رجحانات سے تقابل کی بات ہو، نظام صدیقی کا ماننا ہے کہ مابعد جدیدیت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو لکھنے والوں کو آزادی فراہم کرتا ہے اور یہ نظریات کا مجموعہ ہے۔ یہ تنقید کا ایسا دھارا ہے، جس میں بہت سے دھارے آ کر ضم ہو جاتے ہیں۔ نظام صدیقی کا بیان دیکھیں:

''مابعد جدیدیت موضوعاتی، اسلوبیاتی، ساختیاتی، لفظیاتی اور نحویاتی سطح پر بہت حد تک جدیدیت سے متغائر اور متمائز ہے۔ اس کو اپنے فوری پیشرووں سے سراسر انکار کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو خود ہی اختتامیت Endism بہ کنار ہیں۔ مابعد جدید تنقید کے نئے جمالیاتی اور اقداری معیار (موٹے طور پر) (۱) باغیانہ ریڈیکل کردار (۲) وفور تخلیقیت (۳) کثیر معنیات (۴) متن کا لاشعور (۵) ادب میں سیاسی اور سماجی معنویت (۶) آئیڈ ولوجی کی ہمہ گیر کارفرمائی (۷) قاری اور قرأت کا خلاقانہ تفاعل (۸) حسن پارے کی تمام طرفوں کی واشگافی ہے۔''

(نظام صدیقی، ایوان اردو، فروری ۱۹۹۶)

جدید ترقی پسندی

جدید ترقی پسندی میں موجودہ عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی تبدیلیاں موجود ہیں۔ ان تبدیلیوں کو اپنے اندر سماتے ہوئے نظم ونثر میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس میں موجودہ عہد کی تغیر وتبدل کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خواہ ناول کی بات ہو، ناولٹ کا قصہ ہو، افسانے کا ذکر ہو یا افسانچہ کی چرچا ہو یا پھر شعری ادب یعنی نظم اور غزل کی بات ہو اس صدی میں لکھے جانے والے ادب میں جدید ترقی پسندی کے عناصر ہمیں بخوبی مل جاتے ہیں۔ حقیقت نگاری، رومانیت، ہجر ووصال کے قصے، ظلم واستبداد کی کہانی، سیاسی بدعنوانیاں، ایک انسان پر تشدد کرتی بھیڑ، مذہبی منافرت، طبقاتی کشمکش، دہشت گردی کا نیا چہرہ، خوف ودہشت کی کہانی، عورت کی تار تار ہوتی عصمت، دلتوں، مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں پر مظالم کی روداد، آنر کلنگ جیسے معاملات، مذہب کا ڈھونگ، معاش کی تلاش، بے روزگاری کا کرب، فیشن پرستی، سوشل میڈیا کے معاملات، حیاتیاتی جنگ کے بادل، دنیا کا دو حصوں میں سمٹنا یعنی پولا رائزیشن، امریکہ کا کم ہوتا رعب وداب، سر ابھارتے دوسرے ممالک، آزادی کے نام پر موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت، بلند ہوتی ہوئی حق کی آواز، بڑھتے ہوئے اندھیرے، روشنی کا قتل جیسے موضوعات، جدید ترقی پسندی میں استعمال ہوتے ہیں۔

جدید ترقی پسندی میں ترقی پسندی کی طرح دکھاوے کا معاشرہ نہیں ہے۔ نہ ہی جھوٹ موٹ کا پروپیگنڈہ۔ یہاں تو صرف سچائی، حقیقت نگاری اور ایسی رومانیت جو ہمارے اندر سماج اور ملک کے تئیں محبت وایثار کا جذبہ پروان چڑھائے۔ ایسی رومانیت جو ایک طرف فرد سے ہمدردی اور خلوص کا رشتہ بنائے اور دوسری طرف خارجی عوامل کا بھی خیال رکھے۔ ترقی پسندی میں سب پر لازم آتا ہے کہ وہ مظلوم کا ساتھ دیں اور ظلم کے خلاف کمربستہ ہوں۔ ظلم خواہ سکھ، عیسائی، جین، بودھ کے خلاف ہو، یا دلتوں کے یا سماج کے اعلیٰ طبقات کے خلاف ہو۔

جدید ترقی پسندی کو بہت سے لوگ نئی ترقی پسندی کے نام سے بھی موسوم کرتے

ہیں۔اس صدی کے ادب میں جدید ترقی پسندی کے عناصر نظر آنے لگے تھے۔کچھ ناقدین اور دانشوران نے اس صدی میں ادب کی اس تبدیلی کو بہت پہلے ہی محسوس کرلیا تھا۔۲۰۱۵ میں معروف ومعتبر فکشن نگار اور نقاد شین۔اختر نے ایک کتاب ''نئی ترقی پسند تنقید'' تحریر کی۔ پروفیسر شین۔اختر نے اپنی کتاب میں تنقید کے ان اصول وضوابط کو ضبط تحریر میں لانے اور جدید ترقی پسند تنقید کو متعارف کرانے کی کوشش کی تھی۔

پروفیسر شین اختر (سابق وائس چانسلر رانچی یونیورسیٹی) نے اپنی کتاب ''نئی ترقی پسند تنقید'' میں اس نئی ترقی پسندی کے خدوخال کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''نئی ترقی پسندی ایسے اقدار کو آگے بڑھاتی ہے جس کا تعلق انسان دوستی سے ہے دہشت گردی کے تمام حملے،ظلم وتشدد کی تاریخ سے بھری ہے۔یہ بیرونی طاقتوں کی اجارہ داری اور استحصال پسندانہ معاشی اور سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے جس نے دنیا کو عیسائی اور مسلم ممالک میں بانٹ دیا ہے۔ان کی نظریں تیل کے چشموں سے کشمیر کی خوبصورت وادیوں تک ٹکی ہوئی ہیں۔نیا ترقی پسند...ظلم وجور اور استحصال دیکھ کر خاموش نہیں رہتا۔وہ ہندوستان کی اقلیتوں پر ہونے والے مظالم کو دیکھتا ہے اور احتجاج کا نیا طریقہ کار استعمال کرتا ہے''

اے وطن،خاکِ وطن،وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

شین اختر اپنی کتاب میں مزید لکھتے ہیں۔

> ''نیا ترقی پسند ناقد،مسلم قوم کے مسائل،ان کی خودمختاری،آزادی ،انانیت اور تاریخ میں ان کے عظیم الشان کارنامے کو برابر پیش نظر رکھتا ہے۔وہ مسلمان جس کے سر پر ایک ٹوپی ہوتی ہے،ڈاڑھی بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور جس کا سر پانچ وقت سجدۂ شُکر میں جھک جاتا ہے، وہ یعنی ترقی پسند نقاد اس کا دفاع ہر قدم پر کرتا ہے اور اسے اپنے

فکروفلسفے کاایک اہم جزو سمجھتا ہے .....لیکن ''بنیاد پرستی'' (Fundamentalism) خواہ وہ اسلامی ہو یا عیسائی یا کوئی اور، انسانی سماج اور تہذیب کی دشمن ہے، اس حقیقت سے نیا ترقی پسند ناقد کبھی غافل نہیں رہتا۔''

(نئی ترقی پسند تنقید؛ پروفیسر شین اختر۔ص۔۵۴۔)

جدید ترقی پسندی ہمیں نئے ڈھنگ سے غور وفکر کرنا اور جینا سکھاتی ہے۔ اپنے مذہب کو اچھا بتانا تو صحیح ہے لیکن دوسرے مذاہب پر کیچڑ اچھالنا نہیں بلکہ ان سب کا احترام کرنا جدید ترقی پسندی کے نصب العین میں شامل ہے۔ انسان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انسان دوستی اور عالمی اخوت کو بڑھاوا دینا اور سماج کی تعمیر میں سب کو برابر کا حصہ دار سمجھتے ہوئے سماج کے ہر چھوٹے بڑے، پسماندہ اور اعلیٰ ذات کے لوگوں کو یکساں مواقع فراہم کرنا بھی جدید ترقی پسندی کا اصول ہے۔

پروفیسر قدوس جاوید ہمارے عہد کے ایک معروف ناقد اور دانشور ہیں۔ آپ کی نظر موجودہ ادب پر کافی گہری ہے۔ ادب میں رونما ہونے والی ہر تبدیلی کو وہ ہر پہلو سے پرکھتے ہیں۔ جدید ترقی پسندی کی انگڑائی لیتے رجحان کو انہوں نے بہت پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ نئے ناقدین میں ان کو اس معاملے میں اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے نئی (جدید) ترقی پسندی پر کئی مضامین تحریر کئے اور اقلیتی ڈسکورس کو اردو کہانیوں، ناولوں اور شاعری میں نشان زد کرنے کا کام اس صدی میں سب سے پہلے انہوں نے کیا۔

''معاصر افسانہ نگاروں میں ترقی پسندی، جدیدیت اور ما بعد جدیدیت سے مفاہمت اور مزاحمت کے عناصر سے قطع نظر انسان اور انسانیت کے تحفظ اور تعمیر وترقی کا جو رجحان ملتا ہے اسے نئی ترقی پسندی کا نام دیا جاسکتا ہے مثلاً ایک مردہ سر کی حکایت (ساجد رشید)، صلیب (سلام بن رزاق) صدائے بازگشت (ذکیہ مشہدی) نیو کی اینٹ (حسین الحق)، بوڑھے جاگ سکتے ہیں (مشرف عالمی

ذوقی) ۔گنبد کے کبوتر (شوکت حیات)،ٹھہر جانے والا منظر (عبدالصمد)،برے موسم میں (خالد جاوید) جلدی کرو (شفیع مشہدی)،شہر (ترنم ریاض)،نیم پلیٹ (طارق چھتاری)،سنگھار داں (شموئل احمد)،حد کوئی چاہیے عقوبت کے واسطے (لالی چودھری)،یزید عصر (اسلم جمشید پوری) انا کو آنے دو (احمد صغیر)،الزورا (صدیق عالم)،راستے بند ہے (اسرار گاندھی)،ستیہ وان (شہناز رحمٰن) وغیرہ افسانوں میں نئی ترقی پسندی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں''

(نئی ترقی پسندی: پروفیسر قدوس جاوید)

جدید ترقی پسندی آج ادب کے بہت بڑے حصے کو متاثر کر رہی ہے۔شاعری میں غزل ہو نظم یا پھر دیگر اصنافِ شعر سب میں ظلم کے خلاف علم بلند ہو چکا ہے۔موجودہ حالات میں ظلم کی صورتیں بدل چکی ہیں۔ظلم سہنے والوں کو بھی بعض اوقات ظلم کا احساس نہیں ہوتا اور وہ بے خبری میں ظلم کی مخالفت کی بجائے اس کی حمایت کرنے لگتا ہے۔مگر آج کے شعرا اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھاتے ہوئے شاعری میں،دلتوں،مسلمانوں،عیسائیوں اور مزدوروں،کسانوں،روز کمانے کھانے والے افراد پر ہونے والے ہر ظلم کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں۔سماج میں ہونے والی ہر تبدیلی پر ان کی نظر ہے۔فرد کی زندگی بلکہ اس اندرون اور نئے تعمیر ہوتے معاشرے کے درمیان جو رشتہ ہے۔اس پر ہمارے بیدار مغز شعرا کی نظر ہے۔پروفیسر قدوس جاوید نے اکیسویں صدی میں جدید ترقی پسندی کے رجحان کی نہ صرف وضاحت کی بلکہ مابعد جدیدیت کی موت کا اعلان بھی کیا۔دراصل دنیا میں بہت پہلے ہی مابعد جدیدیت کی موت واقع ہوگئی تھی،مگر اردو میں کوئی بھی بات بہت بعد میں بھی اس وقت پہنچتی ہے جب کوئی اسکالر اس کا اعلان نہیں کرتا ہے۔پروفیسر قدوس جاوید نے جدید ترقی پسندی کے تعلق سے عالمی ادب کا بھی عمیق مطالعہ کیا اور اپنے ایک مضمون میں اس پر طویل اظہار بھی کیا۔

''ترقی پسندی اور جدیدیت کے بعد مابعد جدیدیت ایک سماجی ، ثقافتی اور ادبی سچائی کے طور پر نئی صدی کے آغاز سے پہلے ہی اپنی اہمیت منوا چکی تھی لیکن اب اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک آتے آتے ، عالمی پیمانے پر اور اردو دنیا میں بھی بعض حلقوں کی جانب سے ''مابعد جدیدیت کی موت''(Death of Post Modernism) کی باتیں بھی کی جانے لگی ہیں۔اور ایک طبقہ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ مابعد جدیدیت کے بعد کیا؟اس طرح کے کسی بھی سوال کو ہلکے میں نہیں لینا چاہئے اور اس پر غور کیا جانا چاہئے کہ کیا واقعی مابعد جدیدیت کی موت ہو چکی ہے؟ اگر یہ سوچ درست ہے تو پھر اس پر بھی غور کیا جانا چاہئے کہ ترقی پسندی کو جدیدیت نے معزول کیا تھا۔اور جدیدیت کی جگہ مابعد جدیدیت نے لے لی تھی، لیکن اب ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بعد کئی دانشور ادب اور زندگی کے لئے ایک کہیں زیادہ تازہ کار،حسب حال اور 'تعمیری ادبی نظریہ (تھیوری) کی وکالت کرنے لگے ہیں ۔ نومارکسی نقاد ٹیری ایگلٹن نے اپنے لیکچر The Significance of Theory میں کہا تھا کہ'' اس وقت انسان اور تمام انسانی علوم زبردست بحران سے دوچار ہیں ،اور انسانی علوم کو اس بحران سے نکالنے کے لئے کوئی نیا نظریہ ضروری ہے ۔ فرانسیسی دانشور نِکولس بوریو نے ۲۰۰۹،۱۰ء.میں اور پھر ۲۰۱۵ء.مارکسیت اور مابعد جدیدیت کو رد کرتے ہوئے ''متبادل جدیدیت'' (Alternative Modernism) کا نظریہ پیش کیا ہے۔لیکن بوریو کا یہ تصور ادب کا کوئی جامع تصور ثابت نہ ہو سکا ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ترقی پسندی اور مابعد جدیدیت کے انسان دوست نظریات نے عصرِ حاضر کے انتشار و

بحران کے حقیقت پسندانہ توضیح وتعبیر کے باب میں جو کردار ادا کیا وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔اور چونکہ نئی ترقی پسندی اور اصلاح یافتہ مابعد جدیدیت دونوں کی جڑیں ''نو مارکسیت (NEO MARXISM) میں ہی پیوست ہیں اس لئے آج جو ادب لکھا جارہا ہے اس کا سابقہ رجحانات وتحریکات سے جدلیاتی رشتہ تو ہے لیکن آج یعنی اکیسویں صدی کی تیسری دہائی کا ادب اپنی ایک منفرد شناخت رکھتا ہے''

(نئی ترقی پسندی: نئی جہات، نئے زاویے: پروفیسر قدوس جاوید)

کم وبیش یہی معاملہ اردو نثر کا بھی ہے۔بات خواہ افسانے کی ہو،افسانچے کا ذکر ہو ناول کا معاملہ ہو یا پھر غیر افسانوی نثر کا تذکرہ ہو،سب نے آج کے فرد سے لے کر معاشرے کی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔دلت ڈسکورس،اقلیتی ڈسکورس کے علاوہ کولاژ تکنیک کا استعمال افسانے،افسانچے اور ناول میں خوب ہو رہا ہے۔نئے نئے طریقے سے ناول او افسانے تحریر کئے جارہے ہیں۔اردو فکشن نگار میں سے بعض نڈر اور بے باک انداز میں موجودہ حالات کی بہترین عکاسی کررہے ہیں۔

تحقیق اور تنقید میں بھی اب حقائق کا زیادہ استعمال ہو رہا ہے۔لمبے لمبے انگریزی اقتباسات کا اب زمانہ نہیں رہا۔ادب اب مقامی عناصر کی تلاش ہورہی ہے،یہ دراصل عالمگیریت کا ہی ایک جز ہے۔اب مصنف کا نہیں تصنیف کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔پروفیسر شین۔اختر نے اپنی کتاب ''نئی ترقی پسند تنقید'' میں لکھا ہے:

''آج کی ترقی پسندی سجاد ظہیر کے عہد سے مختلف ہے۔یہ تبدیلی بالکل فطری ہے،اس لئے ناقدین اور تخلیق کاروں کے رویوں میں جو تغیر نظر آرہا ہے وہ کسی حیرت واستعجاب کو جنم نہیں دیتا۔گزشتہ تیس ،چالیس برسوں میں خود سوشلسٹ ملکوں میں حیرت انگیز انقلابات آئے ہیں۔لیکن اس سے بھی اہم واقعہ سائنس کی اس صدی میں

''بنیاد پرستوں'' (Fundamentalists) کی مختلف تحریکیں
ہیں۔ پہلے ان کا ایک حلقہ ہوا کرتا تھا، اب وہ مختلف سیاسی پارٹیوں،
ادبی انجمنوں اور مذہبی جماعتوں میں شامل ہو گئے ہیں''۔

(پروفیسر ش۔اختر، نئی ترقی پسند تنقید، ص۔۶۰، ہم لوگ پبلیکیشنز۔۲۰۱۵ء.)

جدید ترقی پسند تنقید میں فن پارے کو محل وقوع، وجہ تخلیق، تخلیق کا ٹارگیٹ فرد یا معاشرہ، لفظیات کا استعمال، زمانے پر اثرات، اصناف کے اجزا کا تخلیقی استعمال وغیرہ کا خیال رکھتے ہوئے پرکھا اور جانچا جاتا ہے۔ تخلیق کار کا نام زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ نہ ہی یہ بات معنی رکھتی ہے کہ فن پارے میں عالمی مسائل وعناصر موجود ہیں کہ نہیں۔ جدید ترقی پسندی تنقید میں کسی قسم کی مصلحت اور تعلقات کی روادار نہیں، یہ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی میں یقین رکھتی ہے اور اپنی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ اور لن ترانی کے رکھنے میں یقین رکھتی ہے۔

○○○

حواشی

۱۔(اردو ادب کی تحریکیں۔انور سدید، ص ۲۷، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۴)

۲۔(آل احمد سرور، ایوان اردو، اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۸)

۳۔ (منشی پریم چند، اردو ادب کی مختصر تاریخ، انور سدید، ص ۴۲۷، مطبوعہ عالمی میڈیا، دہلی، ۲۰۱۴)

۴۔ (انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص۔۴۶۶، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۴)

۵۔(انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں ص، ۴۷۱، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۲۰۰۴)

۶۔ (اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، منظر اعظمی، ص ۳۶۸، یو پی اردو اکادمی، ۱۹۹۶)

۷۔ (انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص ۴۲۸، مطبوعہ، عہ عالمی میڈیا، دہلی، ۲۰۱۴)

۸۔(ترقی پسندی، جدیدیت مابعد جدیدیت، گوپی چند نارنگ، ص ۵۸۹، ایڈشاٹ پبلیکیشنز، ممبئی

۲۰۰۴)
۹ ۔ (اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ، خلیل الرحمٰن اعظمی ،ص ۱۲۔۱۱۳ایجوکیشنل بک ہاؤس،علیگڑھ،۲۰۰۲)
۱۰۔(خلیل الرحمن اعظمی ،اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک،ص۲۹،ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۲۰۰۲)
۱۱۔ (پروفیسر قمر رئیس،مقدمہ،ترقی پسند ادب)
۱۲ ۔(ترقی پسند تحریک سفر درسفر،علی احمد فاطمی،ص۔۵،نیا سفر الہ آباد۔۲۰۰۶)
۱۳۔ (شمس الرحمن فاروقی ،جدیدیت کل اور آج،ص۴۲،نئی کتاب پبلشرز،نئی دہلی،۲۰۰۷)
۱۴۔(شمس الرحمن فاروقی ،جدیدیت کل اور آج،ص۴۲،نئی کتاب پبلشرز،نئی دہلی،۲۰۰۷)
۱۵۔(شمس الرحمن فاروقی ،جدیدیت کل اور آج،ص۱۹،نئی کتاب پبلشرز،نئی دہلی،۲۰۰۷)
۱۶۔(وارث علوی،جدید افسانہ اور اس کے مسائل،ص۹۱، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۰)
۱۷۔(شہزاد منظر،جدید اردو افسانہ،ص۴۴۔۴۵،مطبوعہ۱۹۸۸۸)
۱۸۔(لطف الرحمن ،اردو کا افسانوی ادب، بہار اردو اکادمی،ص۱۴۰،مظبوعہ،۱۹۸۷)
۱۹۔(ترقی پسندی،جدیدیت مابعد جدیدیت ، گوپی چند نارنگ،ص۵۸۶،، ایڈ شاٹ پبلیکیشنز، ممبئی۲۰۰۴)
۲۰۔ (نظام صدیقی،ایوان اردو،فروری۱۹۹۶)
۲۱۔ (پروفیسر شین۔اختر ،نئی ترقی پسند تنقید،ص۔۶۰،ہم لوگ پبلیکیشنز۔ ۲۰۱۵ء)

❑❑❑